ذلیل ہے۔ (اگر مفت بھی کوئی دینا چاہیے آپ لوگ لینے کے لئے آمادہ نہیں ہو)

دنیا کی لذات پر ہونے والے کا انجام: اس دنیا کی تمام لذات اور آرام وسکون پہونچانے والے اسباب و ذرائع اس مردہ اور بغیر کان بکری کے بچہ سے بھی کہیں زیادہ حقیر اور ذلیل ہیں۔ اگر اللہ کے نزدیک قدر و منزلت ہے تو آخرت کی ہے اور آخرت میں ان بڑے بڑے محلات، سونے و چاندی کے خزانوں، قیمتی موٹروں اور سواریوں میں پھرنے والے ایسے اغنیاء ورؤساء جن کا رہن سہن معاشرہ شریعت کے خلاف، دل ذکر اللہ وخوف آخرت سے خالی اور روزمحشر حساب کتاب سے بے پرواہ ہوں، کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ قرآن کے الفاظ میں " ان هم الا كا الانعام بل هم اضل " کی حیثیت سے ان کو حق تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ ایسے لوگ حیوانات بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔ اللہ کے ہاں آسودگی کا دارومدار اس پر نہیں کہ بندہ دنیا میں اہل ثروت اور متمول لوگوں میں اپنے آپ کو شامل کردے۔ دنیاوی مال و دولت کو اسی دنیا میں رہنا ہے، کسی نے مرنے کے بعد اپنے ساتھ نہ ایک کوڑی قبر میں لے جانے کی خواہش کی اور نہ ساتھ لے جانے کا کوئی فائدہ ہے۔ یہ کرنسی اور مال و دولت تو ایسا سکہ ہے جن سے دنیا میں تو فائدہ حاصل ہوسکتا ہے مگر آخرت میں یہ سکہ بالکل کھوٹا ہے، جس کی وقعت مٹی کے برابر نہیں۔

آخرت کا سکہ:

آپ حضرات نے کئی دفعہ سرکار دو عالم ﷺ کا فرمان سنا ہے کہ ہر مرنے والے کے ساتھ تین اشیاء قبر تک موجود رہتی ہیں۔ اس کے عزیز اقارب، مال اور اعمال، کسی عزیز نے کبھی اس خواہش کا اظہار نہیں کیا کہ مجھے اس میت کے ساتھ دفن ہونا ہے۔ اور نہ کسی نے میت کے ساتھ اس کے مال کو دفن کرنے کا تصور کیا ہے، بلکہ یہ دونوں چیزیں واپس آجاتی ہیں، میت کے ساتھ جس چیز کی موت کے بعد رفاقت ہوتی ہے وہ صرف اس کے اعمال ہیں۔ وہ رشتہ دار اور مال و دولت جن کے راضی رہنے اور حاصل کرنے کے لئے اس نے زندگی کے انتہائی قیمتی لمحات اور متاع عزیز کو انتہائی بیدردی سے ضائع کردیا۔ انہوں نے بھی سخت موقع پر منہ موڑا اور وہ اعمال حسنہ جن میں سے کچھ پر عمل کیا اور بعض سے غافل رہا وہی تیرے ساتھ قبر میں بھی ساتھی بن گئے۔

محترم حضرات میرے آج کے بیان سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اسلام ترک دنیا اور ترک خواہشات پر مبنی مذہب ہے بلکہ دین متین دنیا کے تمام علائق اور نعمتوں کو اسلام کے بتائے ہوئے سنہرے اصولوں پر چل کر استعمال اور حاصل کرنے کے مجموعہ کا نام ہے۔

ان شاء اللہ اس سلسلہ میں مزید گزارشات اگلے جمعہ کو عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ احکم الحاکمین مجھے اور آپ کو حب دنیا کی بیماری سے بچا کر اپنے مرضیات پر چلنے کی توفیق نصیب فرمادیں۔

ڈاکٹر محمد شمیم اختر قاسمی*

سرسید احمد خانؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

(کیا دونوں رفیق درس اور ایک استاد کے شاگرد تھے؟)

سرسید احمد خانؒ (۱۲۳۳-۱۳۱۶ھ/ ۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (۱۲۴۸-۱۲۹۷ھ/۱۸۳۲-۱۸۸۰ء) دو ایسی عظیم شخصیات ہیں، جن پر بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کو فخر ہے۔ دونوں نے ایک ہی مرکز علم (دہلی کالج) سے علمی سیرابی حاصل کی۔ لیکن آگے چل کر دونوں کے راستے جدا ہو گئے۔ ایک نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و ترقی کے لیے عصری علوم کا ادارہ علی گڑھ میں تو دوسرے نے دینی و مذہبی ادارہ دارالعلوم دیوبند میں قائم کیا۔ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا کہ مسلمان تعلیم میں پچھڑ گئے ہیں، اس کی وجہ سے ان کی حالت گئی گذری سی ہو گئی ہے۔ رائج حکومت میں تو ان کی کوئی وقعت نہیں ہے، برادران وطن سے بھی وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اسی کی تلافی کے لیے دونوں نے تعلیمی میدان کا انتخاب کیا اور مسلمانوں میں اسے رائج کرنے کے لیے اپنی پوری محنت اور بقیہ زندگی کا سارا حصہ اس میں صرف کر دیا۔ یہ بات بھی کافی حد تک درست ہے کہ کسی ایک ادارے سے اس کمی کا ازالہ آسان بھی نہ تھا۔ اس لیے دونوں کا میدان عمل مختلف ہو گیا۔

عام طور سے یہی مشہور ہے کہ دونوں نہ صرف ایک ہی استاذ کے دو شاگرد تھے بلکہ رفیق درس بھی تھے اور مولانا مملوک العلی نانوتویؒ (۱۲۰۴-۱۲۶۷ھ/ ۱۷۸۹-۱۸۵۱ء) کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے مقاصد میں یکسانیت کا پیدا ہو جانا کوئی بعید نہیں۔ یہاں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ دہلی کالج میں جن لوگوں نے بھی تعلیم حاصل کی ان میں بیش تر ایسے ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے محاذ سے ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ سوانح علمائے دیوبند کے مصنف ڈاکٹر نواز دیوبندی لکھتے ہیں:

''سرسید مرحوم و مغفور، مولانا قاسم صاحب، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، مسٹر پیارے

---

* رکن: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، نبی نگر، دھرا، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یوپی)

لال آشوب دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔مولانا قاسم صاحب نے دیوبند میں اور سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ وکالج قائم کیے۔مسٹر پیارے لال آشوب، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حسین آزاد نے پنجاب میں وہ تعلیمی کارنامے انجام دیے ہیں جو حیات جاوید کے مالک ہیں۔''[۱]

جہاں تک ان لوگوں کے رفیق درس ہونے کا تعلق ہے تو میری ناقص معلومات میں براہ راست اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔البتہ آثار وقرائن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بعید نہیں کہ ان لوگوں نے کہیں نہ کہیں بیک وقت کسی بھی عالم دین کے سامنے تعلیمی مراحل طے کیے ہوں گے۔یہ پیچیدگی اس وقت حل ہوجاتی جب مولانا الطاف حسین (۱۲۵۳-۱۳۳۳ھ/ ۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) 'حیات جاوید' میں سرسید کی تعلیمی زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالتے، مگر نہ معلوم کیوں انہوں نے سرسید کے اس اہم گوشے کو نظر انداز کردیا۔تاہم انہوں نے سرسید کے حصول تعلیم کا جو حال بیان کیا ہے اس سے بہت کچھ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔مولانا الطاف حسین حالی سرسید کی ابتدائی تعلیمی مدارج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بسم اللہ ہونے کے بعد سرسید نے قرآن پڑھنا شروع کیا، ان کی ننھیال میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔سرسید نے استانی ہی سے جو ایک اشراف گھر کی پردہ نشیں بی بی تھی، سارا قرآن ناظرہ پڑھا تھا۔وہ کہتے تھے کہ ''میرا قرآن ختم ہونے پر ہدیہ کی مجلس جو زنانہ میں ہوتی تھی وہ اس قدر دل چسپ اور عجیب تھی کہ پھر کسی ایسی مجلس میں وہ کیفیت میں نے نہیں دیکھی'' قرآن پڑھنے کے بعد وہ باہر مکتب میں پڑھنے لگے۔مولوی حمید الدین ایک ذی علم بزرگ آدمی ان کے نانا کے ہاں نوکر تھے، جنہوں نے ان کے ماموں کو پڑھایا تھا، ان سے معمولی کتابیں کریما، خالق باری، آمد نامہ وغیرہ پڑھیں۔جب مولوی حمید کا انتقال ہوگیا تو اور لوگ پڑھانے پر نوکر ہوتے رہے۔انہوں نے فارسی میں گلستاں، بوستاں اور ایسی ہی ایک آدھ اور کتاب سے زیادہ نہیں پڑھا، پھر عربی پڑھنی شروع کی، عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر المعانی اور مطول 'مالا نا قلت' تک پڑھی، مگر طالب علموں کی طرح نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی کے ساتھ۔اس کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم یعنی ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا، جس میں ان کی ننھیال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔انہوں نے اپنے ماموں نواب زین العابدین خاں سے حساب کی معمولی درسی کتابیں: تحریر اقلیدس کے چند مقالے، ہیأت میں شرح چغمنی تک اور ایک آدھ رسالہ متوسطات کا (جو مجسطی سے پہلے پڑھائے جاتے ہیں) پڑھا، مگر تمام رسالے متوسطات کے نہیں پڑھے اور نہ مجسطی کے پڑھنے کی نوبت پہنچی، کیوں کہ آلات رصد کا زیادہ شوق ہوگیا تھا۔چنانچہ آلات رصد بر جندی اور چند رسالے مثل اعمال کرہ، اعمال اصطرلاب، رسالہ صنعت اصطرلاب، ربع مجیب، ربع مقطر، ہلزون، جریب الساعۃ، پرکار تقسیم، پرکار متناسبہ اپنے ماموں سے پڑھے۔اسی زمانے میں طب پڑھنے کا شوق ہوگیا۔حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے، طب کی ابتدائی کتابیں مثل

قانونچہ اور موجز وغیرہ پڑھنے کے بعد معالجات سدیدی، شرح اسباب اور نفیسی امراض عین تک پڑھی اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا۔ پھر پڑھنا چھوڑ دیا۔ جب انہوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعے کا شوق برابر جاری رہا اور دلی میں جو اہل علم اور فارسی دانی میں نام آور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ ان سے ملنے اور علمی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملتا رہا۔''۲

پوری کتاب میں سرسید کی ابتدائی تعلیمی مراحل کا یہی کل اثاثہ ملتا ہے، اس کی روشنی میں جس طرح اور جتنا چاہیں ان کی تعلیمی مصروفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ اقتباس میں کئی باتیں ایسی ہیں جس پر کلام کیا جاسکتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے اتنی ضخیم سرسید کی سوانح عمری لکھی اور اس میں ان کی پوری زندگی اور ان کے ہر کام کو بڑے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جہاں چند جملوں میں ان کے بعض گوشوں کو اجاگر کیا جاسکتا تھا وہاں انہوں نے صفحات کے صفحات سیاہ کردیے ہیں۔ لیکن سرسید کے اس ابتدائی گوشہ کو وہ کیوں نظر انداز کر گئے؟

قرآن مجید ختم کرنے کے بعد ابتدائی درسی کتابیں مولوی حمید الدین سے پڑھیں، ان کے انتقال کے بعد اور لوگ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ یہ کون لوگ تھے اور ان کے نام کیا تھے؟ اس کی وضاحت سے سرسید کے اساتذہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ گویا کہ غور و تحقیق کا گوشہ حالی نے جان بوجھ کر خالی چھوڑ دیا ہے۔

حالی سرسید کی تعلیمی زندگی کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا انہیں تعلیم میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، گھریلو دباؤ اور نظم وضبط کا خیال کر کے انہوں نے ادھوری تعلیم حاصل کی۔

سرسید نے جس طرح بھی تعلیم حاصل کی ہو، مگر انہوں نے وہی کتابیں پڑھیں جو اس وقت لوگ پڑھتے تھے، مگر حالی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی خاص کتابیں نہیں پڑھیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جو کتابیں اور جس انداز سے سرسید نے پڑھی تھیں، اسی طریقہ سے آج بھی اور وہی کتابیں آج تک بعض مدارس میں طلبا کو پڑھائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حالی کے اس انداز بیان کی بے وقعتی ظاہر کرتے ہوئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا حالی نے جن ابتدائی درسی کتابوں کا ذکر کیا ہے وہی کتابیں حال حال تک روایاتی مدارس کے نصاب میں جاری وساری تھیں اور درسِ نظامیہ میں ان کی تعلیم سے بڑی پختہ استعداد پیدا ہوتی تھی۔ مشرقی ہند کے ہندوؤں میں عام طور پر اور کائستھوں میں خاص طور پر شیخ سعدی شیرازی کی گلستاں اور بوستاں بڑی مقدس کتابیں سمجھی جاتی تھیں۔ ان کو بوجھ سمجھ کر پڑھنے والا پختہ استعداد کا مالک ہوتا تھا۔ نیز ان کتابوں کے ذریعے فارسی زبان مسلم طور پر نہ آتی ہو مگر عربی زبان کے قواعد صرف ونحو کو بذریعہ فارسی عبارت سمجھنے اور اس کے ذریعے عربی کے اسباق لینے کی اچھی صلاحیت پیدا ہوجاتی تھی۔ جیسا کہ حالی کے اس جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ ''پھر عربی پڑھنی شروع کردی'' یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم وتحصیل سے منشیانہ استعداد حاصل کرنی سرسید کا مقصود نہ تھا بلکہ زمانہ کے عام رواج کے مطابق

یہ ذریعہ تعلیم تھا۔''۳؎

حالی کے مطابق سرسید نے جب روایتی تعلیم کو ترک کیا اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ گویا سن کے اعتبار سے یہ ۱۸۳۵ء کا زمانہ ہوگا۔ ان کے اگلے بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سرسید کے والد کا انتقال ۱۸۳۸ء میں ہوا، اس وقت سرسید کی عمر کچھ کم بائیس سال کی تھی۔۴؎ باپ کے انتقال کے بعد وہ تلاش معاش کے لیے نکلے اور اپنے خالو مولوی خلیل اللہ کے ساتھ کچہری میں کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ کام کے سلسلے میں دہلی سے نکل کر دوسری جگہوں پر بھی پہنچے۔ ۱۸ر فروری ۱۸۴۶ء کو ان کا تبادلہ ان کی مرضی سے فتح پور سیکری سے دلی کے لیے ہوگیا۔ ۱۸۵۴ء تک وہ دہلی میں ہی سرکاری فرائض انجام دیتے ہے۔ جب دہلی آئے اس وقت ان کی عمر انتیس سال کی تھی۔ اسی زمانہ میں انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد اپنی شہر آفاق کتاب 'آثار الصنادید' لکھی۔

سرسید کا قیام دہلی میں آٹھ سال رہا۔ اس مدت میں انہوں نے سرکاری فرائض انجام دینے کے ساتھ پڑھنے کا بھی شغل جاری رکھا۔ بقول مولانا الطاف حسین حالی:

''یہاں آکر ان کو یہ خیال ہوا کہ جو کتابیں ابتدا میں نہایت کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیا منسیا ہوگئی تھیں، ان کو از سر نو غور اور توجہ سے پڑھیے۔ مولوی نوازش علی مرحوم جو دلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے ان سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا اور کچھ فقہ میں مثل قدوری، شرح وقایہ اور اصول فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتابیں پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقامات حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے استاد سے انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔''۵؎

یہ بات گزر چکی ہے کہ ابتدائی دور میں تعلیم کی تکمیل یا ترک کرنے کے بعد سرسید ذاتی طور پر مطالعہ کرتے رہے۔ اسی دوران غالب (۱۲۱۱-۱۲۸۵ھ/ ۱۷۹۶-۱۸۶۹ء)، صہبائی (م ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) اور آزردہ (م ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء) کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ حالی کے دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی آنے کے بعد انہوں نے اعلیٰ کتابیں مولوی نوازش علی، مولوی فیض الحسن سہارنپوری (۱۲۳۲-۱۳۰۵ھ/ ۱۸۱۶-۱۸۸۷ء) اور مولانا مخصوص اللہ سے پڑھیں۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں براہ راست رفیق درس تھے یا بالواسطہ۔ لیکن یہاں پر یہ بھی عرض کرنا مناسب ہے کہ مولانا حالی نے اپنی پوری کتاب میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ سرسید نے دہلی کالج کے ممتاز استاذ مولانا مملوک العلی نانوتوی سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ حالاں کہ بعض دوسرے مستند بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا مملوک العلی بھی سرسید کے اساتذہ میں سے تھے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ 'حیات

جاوید' میں دوسرے بہت سے علماء اور دوسرے لوگوں کا کہیں اشارۃً تو کہیں قدرے تفصیل سے ذکر ملتا ہے، جب کہ مولانا مملوک علی جو اس وقت کے کبار علماء میں شامل تھے کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ تعجب ہے کہ پروفیسر افتخار عالم نے بھی سرسید کی سوانح عمری مونوگراف کے علاوہ 'سرسید: درون خانہ' جدید اسلوب میں تالیف کی ہے، جو چھپ بھی گئی ہے۔ پوری کتاب پہلے ماہنامہ 'تہذیب الاخلاق' میں قسط وار شائع ہوئی ہے۔ اس میں بھی سرسید کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اب تک پروفیسر صاحب سرسید کے مختلف گوشوں پر مضامین لکھ رہے ہیں۔ اس میں کوئی مضمون ایسا نظر سے نہیں گزرا جس میں سرسید کی تعلیمی زندگی اور ان کے اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہو۔ ضرورت یہ ہے کہ ان کی توجہ اس جانب بھی مبذول ہو اور ان کے قلم سے اس تعلق سے کوئی تحقیقی مضمون منظر اشاعت ہو۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی سرسید احمد خاں سے عمر میں لگ بھگ ۱۵ سال چھوٹے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۲ء میں ہوئی۔ مولانا مملوک علی نانوتوی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے قریبی رشتہ دار تھے، وہ آپ کو اپنے ہمراہ دہلی ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے لے گئے۔ یہاں کی تعلیمی زندگی اور سرگرمیوں کی تفصیل اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

''مولانا محمد قاسم نے آٹھ سال تک مولانا مملوک علی سے کالج کے فارغ اوقات میں ان کے گھر پر تعلیم پائی اور ایک سال دلی کالج میں علم ریاضی کی تحصیل میں گزارا۔ علم حدیث کے لیے وہ شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اپنے زمانے کے باجمال محدث تھے اور جن کا سلسلہ سند حدیث شاہ محمد اسحٰق کے واسطے سے شاہ ولی اللہ تک منتہی ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مفتی صدرالدین آزردہ دہلی کی علمی، ادبی اور مجلسی زندگی کی روح رواں تھے۔ مولانا محمد قاسم نے ان سے بھی کسب فیض کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے حاجی امداداللہؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور عمر بھر ان کی محبت وعقیدت سے سرشار رہے۔''[۲]

سوانح قاسمی کے مصنف مولانا مناظر احسن گیلانی بھی لکھتے ہیں کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی صرف ایک سال ہی دہلی کالج کے طالب علم رہے۔ کالج میں ایک سال کی شرکت کیوں ہوئی، اس کی مصلحت بیان کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''سرکاری عربی کالج میں مولانا نانوتوی کے نام کی شرکت دلی کی تعلیمی زندگی کے صرف ایک سال تک محدود ہے اور یہ ایک سال بھی آپ کا اسم مبارک کالج کے باضابطہ رجسٹر میں شریک رہا۔ غالباً اس وقت کا واقعہ ہے جب عام تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ غالباً آئندہ معاشی زندگی کی سہولتوں کا خیال کر کے شفیق استاد نے مشورہ دیا کہ سرکاری سند حاصل کر لو تو مناسب ہوگا۔''[۳]

اس کے برعکس دہلی کالج میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے قیام کی مدت مولانا اسیر ادروی نے پانچ سال قرار

دی ہے۔۸ جب کہ بعض دوسرے حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا نے بغرض تعلیم آٹھ سال دہلی میں قیام کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے دہلی کالج میں ان کے قیام کے زمانہ کو ہی شمار کر کے ان کے یہاں ٹھہرنے کی کل مدت ۹ سال قرار دیا ہو، حالاں کہ مولانا نے دہلی کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاہ عبدالغنی مجددی محدث (۱۲۳۴-۱۲۹۶ھ/ ۱۸۱۹-۱۸۷۸ء) سے بھی حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی۔ بہرحال ان کے بیان سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ ان کی تعلیم کا سارا انحصار مولانا مملوک علی کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس سال حضرت نانوتوی کالج میں داخل ہوئے اسی سال کالج کے نصاب میں ایک اہم تبدیلی کی گئی۔ انگریزی اور عربی کے دو مختلف شعبے تھے۔ دونوں کا الگ الگ نصاب تھا۔ ان دونوں شعبوں کو ملا کر ایک نصاب مرتب کر کے دونوں شعبوں میں جاری کر دیا گیا، پہلے عربی پڑھنے والے طلباء اسلامی علوم وفنون پڑھتے تھے، جدید علوم ان کے نصاب میں شامل نہیں تھے۔ اب عربی پڑھنے والے طلباء کو بھی حساب، جغرافیہ، جیومیٹری، الجبرا، نیچرل فلسفہ، تاریخ ہند، پولیٹکل اکانومی (معاشیات) وغیرہ کا پڑھنا بھی ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اسی سال یہ نصاب جاری ہوا تھا، اس لیے خالص مشرقی علوم پڑھنے والے طلباء کا رجوع مولانا مملوک علی صاحب کے گھر کی تعلیم کی طرف زیادہ ہوا۔ مگر حضرت نانوتوی کا نام کالج میں لکھا ہوا تھا، اس لیے جملہ نصاب کی کتابوں میں شامل ہونا ضروری تھا ورنہ غیر حاضری متصور ہوتی۔ مگر حضرت نانوتوی باضابطہ جدید علوم کی کلاسوں میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ بہ ظاہر یہ بات قابل قیاس معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ شبہ خود ختم ہو جاتا ہے کہ کالج میں داخل بھی ہوں اور نصاب مکمل نہ کریں۔ امتحان تو پورے نصاب میں لیا جائے گا۔ ان کے استاد نے یہ بندوبست کر دیا کہ مولانا مملوک علی صاحب پرنسپل (سربراہ شعبہ) تھے انہوں نے ایسا نظم کر دیا کہ کلاس میں حاضری ضروری نہ ہو۔ آپ نے ریاضی کے ماسٹر کو بلا کر کہا کہ کلاس میں ان کی غیر حاضری پر ایکشن نہ لیں، میں ان کو خود پڑھالوں گا، اس طرح آپ کا نام کالج میں داخل تھا، مگر بیش تر تعلیم گھر پر ہوتی تھی، کالج میں حاضری بھی دیتے تھے۔''۹

۱۸۴۴ء میں مولانا قاسم نانوتوی دہلی آئے۔ ۸ر یا ۹ر سال تک مولانا مملوک علی سے اور دہلی کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ سرسید احمد خاں ۱۸۴۶ء میں دہلی میں وارد ہوئے اور یہ بھی تقریباً نو سال یا اس سے کچھ کم دہلی میں رہے اور اسوقت انہوں نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں مولانا نوازش علی کے علاوہ مولانا فیض الحسن سہارن پوری بھی ہیں۔ یہ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ (۱۲۳۳-۱۳۱۰ھ/ ۱۸۱۸-۱۸۹۲ء) کے ہاتھ پر بیعت تھے۔۱۰ مولانا کے فضل وکمال کا تذکرہ علامہ سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔۱۱ انہیں سرسید غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کے بعد مترجم کی حیثیت سے لے گئے۔ انہوں نے کافی دنوں تک یہ خدمت انجام دی۔ پھر یہ لاہور تشریف لے گئے اور اورینٹل کالج کے شعبہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔۱۲ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی

حاجی امداد اللہ صاحب سے نہ صرف ارادت ثابت ہے بلکہ انکی حیثیت رفیق کی بھی تھی۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''یہاں (ہندوستان) آکر آپ نے تلقین وہدایت شروع کی اور مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا یعقوب نانوتوی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری اور دوسری برگزیدہ ہستیاں آپ کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئیں۔''[۱۳]

مولانا فیض الحسن اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کو پیر بھائی قرار دیتے ہوئے پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی لکھتے ہیں:

''بانی دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے، دونوں پیر بھائی تھے، تعلیمی مراحل کی تکمیل کے بعد دہلی میں درس وتدریس میں مصروف ہوئے یہاں ان سے مستفید ہونے والوں میں سرسید بھی شامل تھے۔''[۱۴]

مولانا حالی نے سرسید کے اساتذہ میں مولانا نوازش علی مرحوم کا نام لیا ہے۔ خود مولانا حالی نے بھی ان سے تعلیم حاصل کی تھی۔[۱۵] ان کا شمار دہلی کے معروف اساتذہ میں ہوتا تھا اور ان کا درس بھی بہت مقبول تھا، ان کے درس میں طلبا کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

''جس زمانہ میں سرسید مولوی نوازش علی مرحوم سے دلی میں پڑھتے تھے میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بھی ان کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب سید صاحب چند روز کے لیے قائم مقام صدر امین مقرر ہو کر رہتک جانے لگے تو انہوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آپ بھی رہتک چلئے۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور کہا کہ میں بھلا کیوں کر جاسکتا ہوں؟ ایک جماعت کثیر طلبہ کی مجھ سے پڑھتی ہے، ان کو کس پر چھوڑ جاؤں؟ انہوں نے کہا سب طلبا کو بھی ساتھ لے چلئے۔ مولوی صاحب کو اور زیادہ تعجب ہوا کہ اتنے طالب علم کھائیں گے کہاں سے؟ سید صاحب نے کہا آپ ان کے کھانے پینے کا تو فکر کیجئے نہیں، خدا رازق ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نہ چلیں گے تو میں رہتک جانے سے انکار کردوں گا اور اس سے میری آئندہ ترقی رک جائے گی۔ آخر مولوی صاحب کو اس کے سوا کچھ بن نہ آیا کہ وہ مع طالب علموں کی جماعت کے ان کے ساتھ ہولیے اور جب تک رہتک رہنا ہوا سب خرچ سید صاحب کے ذمہ رہا۔''[۱۶]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نوازش علی کا قیام رہتک میں زیادہ دن تک نہ رہا۔ جب سرسید کا کام وہاں پورا ہوگیا اور وہ دہلی آگئے تو مولانا نے بھی دہلی میں اپنی سابقہ جگہ پر آکر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا ہوگا۔

مولانا نوازش علی کو سرسید اپنے ساتھ رہتک لے گئے تاکہ وہ ان کتابوں کو ان سے پڑھ لیں جو اب تک نہیں پڑھی تھیں۔ انہیں ان کے مختصر قیام کا پورا اندازہ تھا، اسی لیے وہ بڑی محنت اور پابندی سے پڑھا کرتے تھے۔ یہاں کی تعلیمی محنت اور جفاکشی کا ذکر کرتے ہوئے سرسید کے سوانح نگار یہ بھی لکھتے ہیں:

''سید میر محمد مرحوم امام جامع مسجد دہلی بیان کرتے تھے کہ جس زمانہ میں سید صاحب رہتک بدل کر گئے ہیں،

میں بھی ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہ صبح سے دس بجے تک مولوی نوازش علی صاحب سے جن کو دلی سے ہمراہ لے گئے تھے، سبق پڑھتے تھے۔ بیس بیس بائیس بائیس صفحے شرح جامی اور قطبی کے وہ ہر روز پڑھ لیتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے کے لیے گیا تھا، مگر اس رفتار سے ان کے ساتھ نہ چل سکا اور واپس دلی چلا آیا۔'' ۱۷

مولانا نوازش علی کا گھر، ان کی مسجد اور مولانا مملوک علی نانوتوی کا گھر کوچہ چیلان میں قریب قریب تھا۔ ۱۸ یہیں مولانا قاسم نانوتوی نے لگ بھگ نو سال قیام کیا تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی جب دہلی آئے تو مولانا نوازش علی کی درس گاہ میں بھی جایا کرتے تھے اور وہاں ان کا دوسرے طالب علموں سے بحث ومباحثہ ہوا کرتا تھا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے رفیق درس مولانا یعقوب نانوتوی (۱۲۴۹-۱۳۰۳ھ/۱۸۳۴-۱۸۸۶ء) ان کی درس گاہ میں مولانا نانوتوی کی شرکت اور وہاں کے بحث ومباحثہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی زمانہ میں ہمارے مکان سے قریب مولوی نوازش علی صاحب کی مسجد میں مجمع طالب علموں کا تھا، ان سے پوچھ پاچھ اور بحث شروع ہوئی، مولوی صاحب کی جب باری آئی سب پر غالب آئے اور جب گفتگو ہوتی اس میں مولوی صاحب کا غلبہ ہوتا۔ بلکہ ہم میں سے جو کوئی مغلوب معلوم ہوتا، مولوی صاحب سے مدد چاہتا یا خود مولوی صاحب اس کو مدد دیتے۔ پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی..... والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے معترض نہ ہو جیو، میں ان کو خود پڑھالوں گا اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو۔'' ۱۹

مولانا محمد سلمان منصور پوی کی صراحت کے مطابق مفتی صدرالدین آزردہ کے تلامذہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء)، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا ذوالفقار دیوبندی (م ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۰۴ء)، مولانا منیر نانوتوی (م ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء)، مولانا مظہر نانوتوی (م ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء)، نواب صدیق حسن خاں (۱۲۴۸-۱۳۰۷ھ/۱۸۳۲-۱۸۸۹ء) اور سرسید جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ ۲۰ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے حوالے سے بھی یہ بات گزر چکی ہے کہ مولانا قاسم نانوتوی نے ان سے علمی استفادہ کیا تھا۔ مولانا سید محمد میاں بڑے واضح انداز میں لکھتے ہیں:

''حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی اور امام ربانی حضرت گنگوہی کے دوسرے استاد مفتی صدرالدین صاحب تھے، جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے مشہور ومعروف تلمیذ اور اس خاندان کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔'' ۲۱

مفتی صدرالدین سے علمی استفادہ کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی ملاقات کا ایک واقعہ 'تذکرۃ الرشید' میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''حضرت گنگوہی فراغت کے کئی سال بعد اپنے اساتذہ سے ملاقات کے لیے دہلی تشریف لے گئے، اسی

سلسلہ میں حضرت مفتی صدرالدین صاحب نے دریافت فرمایا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے بتایا کہ ایک مطبع میں تصحیح کا کام کرتے ہیں، دس بارہ روپے تنخواہ ہے، تو مفتی صاحب نے ران پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''قاسم اتنا سستا، اتنا سستا؟''۲۲

مفتی صاحب کے تاسف سے بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کو بہت قریب سے جانتے تھے اور ان کی ذہانت اور علمی استعداد و قابلیت کا پہلے سے اندازہ تھا جو انہیں درس کے دوران ہی ہوا ہوگا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مفتی صدرالدین صاحب سے کون کون سی کتابیں پڑھیں اس کا پتہ نہیں چلتا، لیکن مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں جو تفصیلات درج کی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ امام نانوتوی کی ذہانت کے وہ قائل تھے، مگر اسی بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا والہانہ تعلق ایک امتحان کے بعد مفتی صدرالدین آزردہ سے قائم ہوا ہوگا۔ غالباً اسی امتحان سے ہی مفتی صدرالدین ان کے علمی استعداد کے معترف ہوئے ہوں گے، مگر یہ بیان بھی محل غور ہے، انہوں نے بالواسطہ ان سے اکتساب علم کیا ہوگا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی 'ارواح ثلاثہ' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''علوم عربیہ کے ممتحن مفتی صدرالدین صاحب ہوئے اور مولانا (محمد قاسم) کا صدرا کا امتحان ان کے پاس گیا۔ انہوں نے کوئی جگہ پڑھوائی، مولانا کے ذہن میں اس کا مطلب نہ تھا، کیوں کہ وہ جگہ کبھی دیکھی بھالی نہ تھی تو اس پر تقریر کی اور خود جان رہے تھے کہ کتاب کا یہ مقصد نہیں۔ مفتی صاحب نے اس پر اعتراض کیے تو مولانا نے مفتی صاحب کو ان ہی تقریروں میں الجھا دیا، لیکن اس پر غور کرتے رہے کہ مطلب کیا ہے، بالآخر اک دم ذہن میں عبارت کا صحیح مطلب آ گیا تو فرمایا کہ مفتی صاحب آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، انہوں نے فرمایا 'یہ بات' فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ اس بات کا جواب تو یہ ہے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا۔ مفتی صاحب نے کہا ہاں یہی پوچھ رہا تھا۔''۲۳

مفتی آزردہ سے مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شاگردی کی یہ دلیل سرسید احمد خاں کے استاذ بھائی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ پھر مولانا حالی نے بھی لکھا ہے کہ مفتی آزردہ سے سرسید احمد خاں نے علمی استفادہ کیا تھا۔ بحث اس سے نہیں ہے کہ دونوں نے مفتی آزردہ سے یا مولانا مملوک علی سے تعلیم حاصل کی دہلی کالج میں یا پھر ان کے ذاتی مکان پر۔ اسی طرح مولانا نوازش علی سے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے علمی فیض حاصل کیا کہ نہیں۔ بعض بیانات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا نوازش کے شاگردوں سے مولانا محمد قاسم سے علمی مجادلہ ہوتا رہتا تھا اور یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ چونکہ مولانا قاسم ان کی مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے تھے، اس لیے کبھی کبھار ان سے استفادہ کیا ہو۔ ہوسکتا ہے اسی دوران سرسید احمد خاں بھی وہاں آتے ہوں۔

مولانا مملوک علی نانوتوی دہلی کے معروف اساتذہ میں سے تھے۔ بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے

استفادہ کیا۔ وہ دہلی کالج کے استاد تو تھے ہی، کالج کے اوقات کے علاوہ اپنے گھر پر بھی طلبا کو پڑھایا کرتے تھے۔ نہ معلوم کیوں حالی نے سرسید کے اساتذہ میں ان کو شامل نہیں کیا۔ بعض دوسرے تذکرہ نویس نے دونوں کے درمیان استاد اور شاگردی کا رشتہ ثابت کیا ہے۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۵ء تک جب وہ دہلی منصفی پر مامور تھے، انہوں نے تحصیل علم میں زیادہ ترقی کی۔ اس زمانہ میں سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا، ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشیں محمد اسحٰق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاد اور محسن مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لیے جاتے ہیں۔''۲۴

ایک دوسری بحث کے تحت شیخ محمد اکرام یہ بھی لکھتے ہیں:

''وہ مرحوم (مولانا مملوک علی نانوتوی) دہلی کالج میں مدرس ہو گئے تھے اور جن بزرگوں نے ان سے تعلیم حاصل کی ان میں سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج، مولانا قاسم بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی سرپرست دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد علی محدث سہارن پوری اور ان کے اپنے صاحب زادے مولانا یعقوب نانوتوی جیسے صاحب علم و فضل شامل ہیں۔''۲۵

مولانا مملوک علی نانوتوی ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے دہلی پہنچے۔ یہاں انہوں نے دہلی کے اساتذہ سے تعلق قائم کیا، مگر بعض وجوہ سے ایک آدھ سبق پڑھانے کے بعد کوئی بھی استاد ان کو اپنی شاگردی میں لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس پریشانی اور ملول کے عالم میں شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچے اور اپنی پریشانی بیان کی:

''تحصیل علم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں اور کیفیت یہ ہے کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتا ہوں وہ ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ اچھا کل آنا۔ مولانا اگلے دن حاضر ہوئے، شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا سبق پڑھا دیا اور فرمایا: جاؤ اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ انکار نہیں کرے گا، پھر ایسی مناسبت ہوئی اور ایسے چلے کہ بڑے بڑے علما ان کے شاگرد ہوئے۔''۲۶

مولانا مملوک علی نے نانوتوی شاہ عبدالعزیز (۱۱۵۹-۱۲۳۹ھ/۱۷۴۶-۱۸۲۴ء) کے علاوہ دہلی میں متعدد اساتذہ سے کسب علم کیا تھا۔ حدیث و فقہ کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ معقول و منقول مولانا رشید الدین خاں دہلوی (م ۱۲۴۹/۱۸۳۳) سے حاصل کی۔ فراغت کے معاً بعد ان کا شغل کیا رہا، اس کا علم نہ ہو سکا۔ مگر وہ جلد ہی دہلی کالج کے استاذ مقرر ہوئے۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی لکھتے ہیں: ''مدرسہ عربی سرکاری، یا مدرسہ دہلی جو بعد میں دہلی کالج کے نام سے مشہور ہوا۔ ہندوستان کی تعلیمی ترقی کی راہ کا ایک سنگ میل ہے۔ یہ کالج انگریزی انتظامیہ نے دہلی کے علمی خاندانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا تھا اور اس کا نام مدرسہ دہلی مقرر کیا تھا۔ دہلی کالج کے قائم کرنے کی

تجویز ۱۸۲۳ء (۱۲۳۹ھ) میں کی گئی تھی۔ جون ۱۸۲۵ء (شوال ۱۲۴۰ھ) میں تعلیمی سال کا افتتاح ہوا، مولانا رشید الدین خاں دہلوی مدرس اول اور مولانا مملوک علی مدرس دوم مقرر ہوئے تھے۔ مولانا رشید الدین خاں کی صحت خراب تھی۔ کالج کے افتتاح کے صرف دو سال بعد مولانا کی (محرم الحرام ۱۲۴۳ھ/ جولائی، اگست ۱۸۲۷ء میں) وفات ہوگئی تھی۔ مولانا کی وفات کے بعد مولانا مملوک علی کالج کے (عملاً) سربراہ ہوئے۔'' ۲۷

مولانا مملوک علی آخر عمر تک یہاں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں بے شمار لوگوں نے ان سے تعلیم حاصل کی، کالج کے علاوہ وہ اپنے گھر پر بھی طلباء کو درس دیا کرتے تھے۔ مولوی کریم الدین پانی پتی (م ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹) ان کی علمی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گھر اس کا محط الرجال طلباء مدرسہ اس کا مجمع علماء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف واقطار ہندوستان میں فاضل ہو کر گئے، سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں۔ ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف وجوار سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسن اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں۔'' ۲۸

اس تفصیل سے اندازہ لگایا جاسکتا کہ سرسید احمد خاں نے کب ان سے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ گویا کہ مولانا مملوک العلی نے دہلی میں تعلیم وتربیت حاصل کی اور یہیں طویل مدت تک درس وتدریس پر مامور رہے۔ اسی مدت میں سرسید نے اس بحر العلم سے تعلیمی مراحل طے کیے ہوں گے۔ مندرجہ ذیل سطور سے بھی یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید نے مولانا مملوک العلی سے تعلیم پائی تھی۔ مولانا اسیر ادروی لکھتے ہیں:

''۴ر محرم ۱۲۶۰ھ، جنوری ۱۸۴۴ء میں آپ (قاسم نانوتوی) عربی کالج دہلی میں داخل ہوئے یہاں آپ کی تعلیم کا آغاز نحو کی مشہور کتاب قافیہ سے ہوا۔ مولانا مملوک علی نانوتوی کی پوری زندگی تعلیم وتدریس میں گذری تھی۔ وہ اپنے عہد کے انتہائی تجربہ کار اور طلبہ کے مزاج شناس استاد تھے۔ ان کی تدریسی خدمات پر ایک طویل مدت گذر چکی۔ ذہین سے ذہین طلبہ ان کے حلقہ درس میں آتے رہے اور جوہر قابل بن کر جاتے رہے۔ یہ تلامذہ اپنے استاذ کے قدرداں اور ثناخواں رہے۔ خود سرسید احمد خاں جو آپ کے شاگردوں میں ہیں، ان کو اپنے استاد سے کتنی گہری عقیدت تھی اس کا اندازہ ان کی دوسطری تحریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''علم معقول ومنقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان کتابوں کو گنجینۂ عالم خالی ہو جائے تو ان کے لوح حافظہ سے پھر نقل ان کی ممکن ہے۔'' ۲۹

اس خیال کو مزید تقویت پروفیسر اختر الواسع صاحب کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے کہ

دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''کیا اس حقیقت سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے کہ دونوں اداروں کے بانی ولی اللہ مکتب فکر کے پروردہ تھے اور دونوں نے مولانا مملوک علی ہی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا تھا۔''۳۰

مولانا سید محمد میاں نے مولانا مملوک علی کے نامور شاگردوں کا ذکر اپنی مشہور زمانہ کتاب 'علمائے ہند کا شاندار ماضی' میں کیا ہے اور ان کے شاگردون میں سرسید احمد خاں کو بھی شامل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''(مولانا مملوک علی) عرصہ دراز تک دہلی کی عربی یونیورسٹی میں جو اس وقت مدرسہ شاہ جہاں آباد یا مدرسہ غازی الدین کہلاتا تھا، عربی علوم وفنون کا درس دیتے رہے۔ پھر یہاں شعبہ عربی کے صدر بنادیے گئے۔ اس دور کے بلند پایہ فضلاء اور علماء زیادہ تر آپ ہی کے شاگرد تھے۔ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، سرسید احمد صاحب (بانی یونیورسٹی علی گڑھ) ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی (صاحب ترجمہ) شمس العلما ذکاء اللہ خاں صاحب اور آپ کے فرزند رشید مولانا یعقوب صاحب جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس بنائے گئے جو اپنے والد ماجد کی طرح علوم عقلیہ ونقلیہ کے بہترین فاضل اور جامع ترین شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے۔''۳۱

یہ بات بڑی اہم ہے دونوں کے درمیان رفیق درس کے رشتے کو ثابت کرنے کے لیے کہ مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید کی ملاقات دہلی ہی میں اس وقت ہوئی ہوگی جب وہ اپنا تبادلہ کرا کے دہلی آئے تھے۔ چوں کہ مولانا قاسم نانوتوی اپنے تمام ساتھیوں میں بڑے تیز تھے اور حاضر جواب بھی، اس لیے وہ اپنے ساتھیوں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ سرسید کی ان دنوں کہیں نہ کہیں مولانا قاسم نانوتوی سے ملاقات ہوئی ہوگی۔ تبھی تو وہ ان کے حافظہ اور استعداد علمی کے آخر تک قائل رہے۔ جب تک کسی آدمی کو بہت زیادہ قریب سے نہ دیکھا اور پرکھا گیا ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے ابتدائی زمانہ طالب علمی کے حالات کو من وعن اسی طرح بیان کردیا جائے جیسا کہ وہ ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سرسید احمد خاں کے وہ تعزیتی مضمون جو انہوں نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے انتقال کے بعد لکھا تھا، اس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے جس سے صحیح صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دونوں نے کسی استاذ کے سامنے ایک ہی وقت میں ضرور زانوئے تلمذتہ کیا ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''لوگوں کا خیال تھا کہ جناب مولوی اسحٰق کے کوئی ان کے مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں، مگر مولوی قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کردیا کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدون مولوی محمد اسحٰق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے۔ جب کہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔ بہت سے لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم صاحب کو نہایت کم عمری میں دلی

میں تعلیم پاتے دیکھا ہے۔انہوں نے جناب مولوی مملوک علی صاحب سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا: بالائے سرش زہوش مندی می تافت ستارہ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم وفراست میں معروف مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل وکمال تھے۔ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کی صحبت سے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابند شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔''[۳۲]

سرسید نے جس انداز میں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے،اس سے بڑی حد تک یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ گرچہ سرسید ان سے عمر میں بڑے تھے،مگر ان کو مخاطب ٹھیک اسی انداز سے کرتے ہیں جیسے ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو کرتا اور اس کی اچھی باتوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے۔مولانا مملوک علی صاحب اور شاہ اسحٰق صاحب کے ساتھ انہوں نے بزرگی اور اور ان کے بڑے ہونے کا خیال اور لحاظ کیا ہے،جب کہ مولانا قاسم نانوتوی کو جس انداز میں یاد کیا ہے وہ اس سے رفیق درس ہونے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔لہٰذا یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید احمد اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نہ صرف ایک بلکہ کئی استاد کے شاگرد تھے۔ساتھ ہی انہیں ان اساتذہ کے سامنے ایک ہی وقت میں بلا واسطہ کہیں نہ کہیں پڑھنے کا بھی موقع ملا ہوگا۔

مآخذ ومراجع

۱۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی،سوانح علمائے دیوبند،نواز پبلیکیشنز،دیوبند،۲۰۰۰ء،ج:۲،ص:۲۹

۲۔ مولانا الطاف حسین حالی،حیات جاوید،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،۱۹۸۲ء،ص:۵۵-۵۶

۳۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق،علی گڑھ (سرسید نمبر) اکتوبر ۱۹۹۰ء،ص:۳۲،مضمون:سرسید کی درسی تعلیم

۴۔ حیات جاوید،ص:۶۰ ۵۔ ایضاً،ص:۶۴

۶۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ،دانش گاہ پنجاب،لاہور،۱۹۸۶ء،ج:۱۹،ص:۵۰۵

۷۔ مولانا مناظر احسن گیلانی،سوانح قاسمی،مطبوعہ دارالعلوم دیوبند،۱۳۷۳ھ،ج:۱،ص:۲۲۴

۸۔ اسیر ادروی،مولانا محمد قاسم نانوتوی:حیات اور کارنامے،شیخ الہند اکیڈمی،دارالعلوم دیوبند،۱۹۹۷ء،ص:۵۲

۹۔ ایضاً،ص:۵۵-۵۶

۱۰۔ شیخ محمد اکرام،موج کوثر،ادبی دنیا،مٹیا محل دہلی،۱۹۹۰ء،ص:۱۹۵